علی گڑھ ڈائسپورہ - ۷

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے صدسالہ جشن کے فِنالے (دسمبر ۲۰۲۱) کی تقریب سے شروعات

علیم صاحب

وائس چانسلر: ۱۹۶۸-۱۹۷۴

از
پروفیسر محمد اقبال
سابقاً شعبۂ علم نباتات، جامعہ ہمدرد، نئی دہلی-۶۲

یہ ۱۹۶۸ء کی بات ہے کہ ہم نے پہلی بار علیگڑھ مسلم یونیورسٹی میں قدم رکھا تھا اور اسی سال پروفیسر عبدالعلیم صاحب نے شیخ الجامعہ کی حیثیت سے یونیورسٹی کی زمام اقتدار سنبھالی تھی۔ نو منتخبہ طلبا یونین کی تنصیب کے موقع پر وائس چانسلر عبدالعلیم صاحب کو پہلی بار قریب سے دیکھنے کا موقع ملا۔ پہلی نظر میں کچھ ایسا محسوس ہوا کہ ہم صدر جمہوریہ ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب کے کسی ہمزاد کو دیکھ رہے ہیں۔ وہی سرخ وسفید رنگت، وہی لگ بھگ فرنچ کٹ ڈاڑھی، وہی سفید شیروانی اور چوڑی دار پاجامہ، بس جسامت میں علیم صاحب تھوڑے بھاری نظر آتے تھے۔ علیم صاحب کا چہرہ بشرہ بہت نورانی لگتا تھا۔ ان کی شخصیت میں بڑا ٹھہراؤ اور شاہانہ دبدبہ تھا۔ اکثر سفید شیروانی اور بڑے پائینچے کا پاجامہ پہنتے تھے، بسا اوقات منہ میں سگار دبا ہوتا تھا۔ جب سوچتے تو آہستہ آہستہ ڈاڑھی کو کھجلاتے تھے۔ بہت کم بولتے تھے۔ ان کے جوابات اکثر 'ہوں'، 'ہاں'، 'نہیں'، 'اچھا'، 'ٹھیک ہے' اور 'دیکھیں گے' تک ہی محدود رہتے تھے۔ چونکہ عموماً وہ صرف سنتے تھے، بولتے نہیں تھے، لہٰذا کچھ حلقوں میں وہ ''سنّی'' (سننے والا) اور کچھ میں گوتم بدھ کے نام سے بھی مشہور تھے۔

ایک مرتبہ ہمارے وقارالملک ہال کے سالانہ فنکشن میں علیم صاحب تشریف لائے، اور اپنی نئی نویلی بہو (ڈاکٹر حلیم صاحب کی اہلیہ) کو بھی ساتھ لائے۔ اس دن ہم نے بڑے ذوق وشوق سے پہلی بار وائس چانسلر صاحب اور 'افراد خانہ' ساتھ فوٹو کھنچوائے۔ لکھنؤ کے شفیق الرحمان ایڈوکیٹ صاحب اس تقریب کے مہمان خصوصی تھے۔ علیگڑھ مسلم یونیورسٹی کے اقلیتی کردار کی بازیابی کی تحریک میں مرحوم کا رول بہت نمایاں تھا' لہٰذا طلبا برادری میں وہ بہت مقبول تھے۔ شفیق صاحب نے حسب توقع اقلیتی کردار کے حوالے سے حوصلہ افزا تقریر کی اور علیم صاحب نے بھی خلاف توقع مثبت رخ اختیار کیا۔ دونوں حضرات ڈاڑھی' ٹوپی اور شیروانی والے' ظاہری حلیہ سے اچھے روایتی مسلمان اور انگریزی زبان کے خوش بیان مقرر، دونوں ہی کے لیے ہمارے دل میں بےحد احترام کا جذبہ موجزن ہوا۔

شیخ الجامعہ ہوجانے کے بعد بھی علیم صاحب منتظم کم اور استاد زیادہ لگتے تھے، طلباء کے تئیں اُن کے دل میں بے پناہ شفقت تھی۔ ان کی اس خوبی یا کمزوری کو چالاک طلبا پوری طرح بھانپ گئے تھے، اور اس سے فائدہ اٹھانے میں کبھی چوکتے بھی نہیں تھے۔ ایک مرتبہ شاید کلاس میں حاضری کا معاملہ تھا، بہت سے طلبا امتحانات میں شرکت کے مجاز نہیں تھے۔ طے پایا کہ سینیر طلبا کا ایک گروپ براہ راست شیخ الجامعہ سے رحم کی درخواست کرنے جائے۔ اس تحریک میں وقار الملک ہال کے طلبا پیش پیش تھے، شاید اس لیے کہ ان دنوں کئی اہم طالب علم لیڈر (الطاف احمد اعظمی، محمد اعظم خاں، محمد شاہد خاں، مسرور احمد خاں، ماشاءاللہ خاں وغیرہ) اسی ہال میں سکونت پذیر تھے۔ ایک رات بہت سے طلبا کا ہجوم وائس چانسلر کی رہائش گاہ پر پہونچا اور علیم صاحب سے دادرسی کی فریاد کی۔ علیم صاحب ایک کرسی پر تشریف فرما تھے جسے چاروں طرف سے لڑکوں نے گھیر لیا تھا۔ علیم صاحب نے کافی برہمی کا مظاہرہ کیا لیکن طلبا حسب پروگرام سعادت مندی کے ساتھ سر جھکائے کھڑے رہے اور آخر میں کچھ نے ان کے پاؤں پکڑ لیے، موصوف نے لاکھ مزاحمت کی لیکن پاؤں نہ چھوڑے گئے۔ آخر کار علیم صاحب نرم پڑ گئے اور فرمایا ''اچھا۔ دیکھیں گے، تم لوگ جا کر اپنی پڑھائی کرو''۔ علیم صاحب کے ''دیکھیں گے'' کا مطلب یہی لیا جاتا تھا کہ کام ہوگیا۔ لہٰذا ان کی زبان سے یہ الفاظ نکلتے ہی پورا وی سی لاج ''وائس چانسلر زندہ باد'' کے نعروں سے گونج اٹھا۔ ان دنوں موصوف کی نرم دلی کا خوب استحصال ہوا۔ چھوٹے چھوٹے حیلے بہانے امتحانات کو ملتوی کرانے کے لیے کافی مانے جانے لگے۔ رات میں بجلی نہ آئی تو اگلی صبح کا امتحان ملتوی کرالینا کوئی بڑی بات نہ رہی۔

جلسۂ تقسیم اسناد (کنووکیشن) کے موقع پر علیم صاحب کی بھاری بھرکم شخصیت بہت نکھر کر سامنے آتی تھی۔ مسلم یونیورسٹی کی یہ روایت ہے کہ وہاں ڈگریاں تفویض کرنے کے عمل میں عربی زبان کا استعمال ہوتا ہے۔ جب ڈین صاحبان اپنی فیکلٹی کے طلبا کو شیخ الجامعہ کی خدمت میں پیش کرکے انہیں ڈگری عطا کرنے کی درخواست کرتے ہیں، اور جواب میں شیخ الجامعہ اپنی منظوری کا اظہار فرماتے ہیں، تو ایجاب وقبول کے تمام طے شدہ جملے عربی زبان میں ہی ادا کیے جاتے ہیں۔ علیم صاحب تو عربی کے زبردست عالم تھے لہٰذا اپنی تیز آواز اور مخصوص سپاٹ لہجے میں بڑی روانی اور صحت الفاظی کے ساتھ تیزی سے اپنی بات کہہ جاتے تھے مگر ڈین حضرات کو اپنا مدّعا پیش کرنے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگانا پڑتا تھا۔ حالانکہ وہ محض پہلے سے لکھے جملوں کو پڑھتے ہی تھے مگر بہت سوں کو یہ بھی بہت بھاری پڑتا تھا۔

علیم صاحب کے بارے میں طرح طرح کی باتیں کہی گئیں مگر ان کی ذاتی انا یا خودداری نے موصوف کو اپنے بارے میں کوئی صفائی پیش کرنے سے ہمیشہ روکے رکھا۔ مخالفین نے جم کر اس صورت حال کا فائدہ اٹھایا۔ کمیونسٹ نقطۂ نظر سے علیم صاحب کا گہرا تعلق بھی ان کی مخالفت کا سبب بنا۔ ان پر بہت سے الزامات عاید کیے گئے، کبھی عقیدے تو کبھی کارکردگی کے تعلق سے، مگر وہ بنا کسی صلح صفائی کے ہمیشہ اپنے موقف پر اٹل رہے۔ جب سرسید ہاؤس کی تعمیر نو کا کام چل رہا تھا تو انہی دنوں دودھ پور میں علیم صاحب کا مکان بھی زیر تعمیر تھا۔ موقع کو غنیمت جان کر کچھ لوگوں نے کانا پھوسی شروع کردی۔ علیم صاحب کی اہلیہ محترمہ نے ایک دن ان سے دریافت کیا کہ لوگ آپ کے بارے میں افواہیں پھیلا رہے ہیں، آپ تردید کیوں نہیں کرتے؟ علیم صاحب نے فرمایا کہ جو لوگ میری نیت پر شک کرتے ہیں یا مجھے بدنام کرنا چاہتے ہیں، کیا وہ میری تردید سے مطمئن ہوجائیں گے؟[۱]

عبدالعلیم صاحب کی ولادت ۲۵ /اگست ۱۹۰۷ء کو اتر پردیش کے موضع پہتیا ضلع غازی پور میں ہوئی۔ ان کا نام مشہور عالم دین اور شاعر جناب مولوی عبدالعلیم آسی غازی پوری نے اپنے نام پر رکھا تھا۔ علیم صاحب کے آباواجداد کا تعلق تاشقند سے تھا اور ان کا سلسلہ حضرت عبیداللہ احرارؒ سے ملتا تھا۔ ابتدائی ایام میں علیم صاحب اپنے نام کے ساتھ احراری لکھتے بھی تھے۔ علیم صاحب کے والد مولوی عبدالعظیم صاحب غازی پور کے ایک ممتاز وکیل تھے۔ کہتے ہیں کہ کسی مقدمہ کو ہاتھ میں لینے سے پہلے وہ مدّعی سے خوب جرح کرتے تھے اور اس کے موقف کی صداقت واضح ہوجانے پر ہی کیس کو قبول کرتے تھے۔ عبدالعظیم صاحب تعلیمی کاموں میں بہت دلچسپی رکھتے تھے۔ غازی پور کا مدرسہ ''چشمۂ رحمت'' ان ہی کا قایم کیا ہوا ہے۔

علیم صاحب کی ابتدائی تعلیم گھر پر ہوئی۔ ان کا حافظہ بہت

اچھا تھا۔ قرآن کریم کی پڑھائی کے دوران وہ ۱۹ پارے حفظ کر گئے تھے، حالانکہ اس وقت وہ محض پہلی جماعت میں تھے۔ مدرسہ چشمۂ رحمت سے انکی باقاعدہ تعلیم کا آغاز ہوا۔ طالب علمی کے زمانے میں انہوں نے ایک دینی اور ادبی سہ ماہی رسالے کی اشاعت کا آغاز کیا۔ ستمبر۱۹۲۴ کے شمارے میں انکا ایک مضمون 'رحمت الٰہی' شائع ہوا' اسوقت وہ بارہویں کلاس کے طالب علم رہے ہونگے۔ مضمون کا آغاز کچھ اسطرح سے ہوا:

''اللہ کی ہستی سے زیادہ حسین وجود کسی کا نہیں' مگر اسکا یہ حسن اسکی صفات کی شکل میں جلوہ گر ہوتا ہے۔ سورج اسکے جلال کا ایک ادنیٰ پرتو ہے۔ بدر کامل اسکے جمال کا ایک حقیر نمونہ ہے۔ آسمان اسکی عظمت کا ایک معمولی سا نشان ہے۔ بارش اسکی رحمت کا محض ایک قطرہ ہے۔ زندگی اسکی قدرت کا صرف ایک اشارہ ہے۔ مخلوقات میں پائی جانیوالی محبت اسکی شفقت کا ایک ذرہ ہے۔ اللہ کی صفات کاملہ کا مخلوقات میں یہی ظہور وہ ذریعہ ہے جس سے بندۂ مومن یہ جانتا ہے کہ اسکا رب کیسا ہے۔''

اسی مضمون میں آگے لکھتے ہیں:

''اس بے مثل اللہ کی معرفت اگر کسی انسان کو حاصل ہوجائے تو وہ خود بھی کامل ہوجاتا ہے۔ اللہ کی بندگی اسکی زندگی ہوجاتی ہے۔ مخلوق سے محبت اسکی عادت بن جاتی ہے۔ صبر اسکی سیرت اور شکر اسکا طریقہ بن جاتا ہے۔ اسکی خوراک' اسکی گفتگو' اسکی عادت' اسکے قابو میں ہونے کے باوجود اسکے رب کی مرضی کے خلاف نہیں جاتی' اور کبھی چلی جائے تو وہ توبہ کے آنسوؤں سے اپنے ہر داغ کو دھوڈالتا ہے۔''[۲]

اٹھارہ' انیس سال کی عمر میں ہی وہ اچھے خاصے اشعار بھی کہنے لگے تھے۔ مسلم اینگلو ورنا کولر اسکول کی سالانہ تقریبات میں مشاعرہ ہوا کرتا تھا اور اسے شائع بھی کیا جاتا تھا۔ ۱۹۲۶ کی اشاعت میں علیم غازی پوری کے یہ اشعار شامل تھے:

اجڑا اجڑا سا آشیاں ہی سہی
نہ سہی فصل گل' خزاں ہی سہی
تم نے مجھ سے کیا تھا عہد وفا
خیر' یہ پچھلی داستاں ہی سہی !
مختصر ہے' مگر حسین تو ہے
زندگی' شیشے کا مکاں ہی سہی [۲]

ان دنوں ۱۶ سال سے کم عمر والے بچوں کو میٹرک کے امتحان میں بیٹھنے کی اجازت نہیں تھی۔ اگرچہ اسکول میں علیم صاحب کا سال پیدائش ۱۹۰۷ء کے بجائے ۱۹۰۶ء لکھایا گیا تھا، تاہم جب وہ دسویں کلاس میں آئے تو امتحان کے لیے مطلوبہ عمر سے دو برس چھوٹے تھے۔ بعد میں یہ مدّت ۱۶ کے بجائے ۱۵ سال کردی گئی، لہٰذا ایک سال انتظار کے بعد وہ امتحان میں شرکت کر سکے۔ اسی فرصت کے دوران انہیں ناول پڑھنے کا چسکہ لگ گیا۔ پہلے اسکاٹ کو پڑھا، پھر ڈکنس کو، بعد میں فرانسیسی ناولوں کے تراجم ان کے مرکز نگاہ بنے۔ عبدالحلیم شرر کے ناولوں سے متاثر ہوکر اسی انداز میں خود بھی لکھنے کی کوشش کرنے لگے۔ فرصت کے اس ایک سال نے مزید گل یہ کھلائے کہ نوجوان علیم کے دل میں جذبۂ آزادی کا چراغ روشن کردیا۔ خلافت تحریک اس زمانے میں عروج پر تھی۔ کم عمری میں ہی وہ خلافت کمیٹی کے سیکریٹری بن گئے۔ غازی پور میں اس تحریک کے سلسلے میں ایک جلسہ ہوا جسمیں پُر جوش تقریروں کے بعد ولایتی کپڑوں کی ہولی جلائی گئی۔ علیم صاحب نے بھی اپنے سر سے ترکی ٹوپی اتار کر آگ میں ڈال دی۔ اسی وقت سے کھدّر پہننا شروع کیا اور کم از کم ۱۹۴۷ء تک اس پر سختی سے کاربند رہے۔[۱]

قومی لیڈروں کی تقریروں سے متاثر ہوکر نوجوان عبدالعلیم نے گھر میں اعلان کردیا کہ اب مزید وہ سرکاری اسکول میں نہیں پڑھیں گے۔ چونکہ فطرتاً کم گو تھے اور والدِ محترم کا رعب بہت زیادہ تھا لہٰذا اپنی بات لکھ کر ان تک پہونچاتے تھے۔ علیم صاحب نے اسکول جانا بند کردیا اور والد صاحب کو لکھ بھیجا کہ گاندھی جی کا مشورہ اور قوم کی آزادی کا مسئلہ مجھے سرکاری اسکول میں حصول تعلیم سے روک رہے ہیں۔ اس واقعہ نے والدین کو تشویش میں مبتلا کردیا۔ ایک روز یہ معاملہ گھر میں زیر بحث تھا۔ علیم صاحب کے ماموں جان نے ان کو سناتے ہوئے طنزیہ انداز میں کہا کہ آجکل کے لڑکوں کو پڑھنے لکھنے کا شوق تو ہے نہیں، بہانے کے لیے قومی سیاست کا سہارا لے لیتے ہیں۔ یہ حربہ کارگر ثابت ہوا۔ علیم صاحب نے اپنے والد صاحب کو مطلع کیا کہ وہ امتحان دینے کو تیار ہیں بشرطیکہ آئندہ کی تعلیم کے لیے انہیں جامعہ ملیہ بھیجا جائے۔ والد صاحب نے اس پر حامی بھرلی۔ پڑھنے لکھنے میں تو شروع سے ہی تیز تھے، میٹرک کا امتحان اوّل درجے میں پاس کیا اور عربی میں امتیازی نمبر حاصل کیے۔ صوبے کے سب سے زیادہ نمبر پانے والے دس بارہ طلبا میں شمار ہوئے اور سولہ روپے ماہانہ کا وظیفہ بھی پایا۔[۱]

حسب وعدہ والد صاحب بیٹے کو جامعہ بھیجنے پر راضی ہوگئے۔ یہ ۱۹۲۲ء کی بات ہے۔ ان دنوں جامعہ بھی علیگڑھ میں واقع تھی۔ عبدالعلیم کے ایک ہم وطن، ابونصر ہاشمی، ان دنوں علیگڑھ مسلم یونیورسٹی میں زیر تعلیم تھے۔ انہی کے ساتھ عبدالعلیم علیگڑھ آئے اور منٹو سرکل میں قیام کیا۔ ابونصر ہاشمی کا ڈاکٹر ضیاالدین صاحب کے گھر آنا جانا تھا اور ڈاکٹر صاحب ان دنوں یونیورسٹی کے پرو وائس چانسلر تھے۔ انہوں نے پیشکش کی کہ عبدالعلیم اگر یونیورسٹی میں داخلہ لینا چاہیں تو جتنا وظیفہ ان کو حکومت سے ملے گا اتنا ہی یونیورسٹی سے بھی دلادیں گے اور فیس بھی معاف کردی جائے گی۔ اس پیشکش کو نظر انداز کرتے ہوئے عبدالعلیم نے جامعہ کے درجہ ابتدائی میں داخلہ لے لیا اور اس میں ٹاپ بھی کیا۔ جب بی اے (آنرز) میں داخل ہوئے تو وہ انگریزی میں آنرز کرنا چاہتے تھے لیکن شیخ الجامعہ خواجہ عبدالمجید صاحب کی صلاح پر پہلے تاریخ کی طرف راغب ہوئے مگر بعد میں عربی کا انتخاب کرلیا۔ ۱۹۲۶ء میں انہوں نے یہ کورس مکمل کیا۔ اس دوران موصوف کو عربی زبان پر دسترس حاصل ہوچکی تھی اور تاریخ اسلام سے گہرا شغف پیدا ہوگیا تھا۔ ایک تبدیلی یہ ہوئی کہ کم گو عبدالعلیم اب تقریریں کرنے لگے تھے۔ انہیں انجمن اتحاد طلبا کا نائب صدر چُن لیا گیا۔ اس کے صدر شیخ الجامعہ ہوا کرتے تھے۔ اس دوران جامعہ ملیہ میں اردو اکادمی کا قیام عمل میں آیا۔ عبدالعلیم اور سعید انصاری صاحبان اس کے اوّلین فیلو منتخب ہوئے۔ اس حیثیت میں علیم صاحب نے انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا میں مشہور جرمن مستشرق ولہاوزن کے ایک مضمون کا، جو سیرت نبوی سے متعلق تھا، ترجمہ کرکے اس پر حواشی لکھے اور ایک مفصل مقدمہ تحریر کرکے مصنف کے اعتراضات کا بھر پور جواب دیا۔ اس سارے متن کو مکتبہ جامعہ نے اسی وقت 'سیرت نبوی اور مستشرقین' کے عنوان سے شائع کردیا۔ بعد میں اس کتاب کے کئی ایڈیشن شائع ہوئے۔ 'دانتے اور اسلام' بھی ان کا ایک عالمانہ مقالہ تھا جو موصوف نے محض ۱۹ سال کی عمر میں ۱۹۲۶ء میں شائع کیا تھا۔ کم از کم دو مضامین کی اشاعت پر 'شذرات' میں ان کو جامعہ ملّیہ کے مایۂ ناز طالب علموں میں گردانا گیا۔ فروری ۱۹۳۳ء کے 'جامعہ' میں سجاد ظہیر کی متنازعہ کتاب 'انگارے' پر ان کا بے باک تبصرہ بہت مقبول ہوا تھا۔

علیم صاحب نے امام ابوحنیفہؒ سے منسوب رسالہ 'معرفت المذاہب' اور ابن سراج کے 'تذکرۃ المذاہب' کی تصحیح و تدوین کی۔ علاوہ ازیں 'البیان فی اعجاز القرآن' (احمد ابن الخطابی) اور 'کتاب النکت فی اعجاز قرآن' (لابی الحسن علی بن عیسیٰ الرمانی) کی بھی تصحیح و تدوین کے بعد ان پر عربی' انگریزی اور اردو میں مقدمات لکھے۔ نامور صحافی عابد سہیل (مرحوم) نے علیم صاحب کے بیس مقالوں اور چند خطوط کو یکجا کرکے بعنوان 'عبدالعلیم کی منتخب تحریریں' نیشنل بک ٹرسٹ (انڈیا) کی وساطت سے ۲۰۰۸ء میں شائع کیا تھا[۳]

۱۹۲۹ء میں علیم صاحب پی ایچ ڈی ریسرچ کے لیے برلن چلے گئے۔ روانگی سے چند روز قبل ان کی شادی گورکھپور کے قاضی خاندان میں عصمت النساء صاحبہ سے ہوئی۔ ان دنوں برلن یونیورسٹی (موجودہ ہمبالٹ یونیورسٹی) پی ایچ ڈی کے ساتھ ایم اے کی ڈگری بھی دیا کرتی تھی۔ علیم صاحب کا خصوصی مضمون اسلامیات تھا جس میں ان کے گائیڈ مشہور مستشرق پروفیسر کارل بیکر تھے۔ انہوں نے لازمی مضمون کے طور پر فلسفہ اور تیسرے مضمون کے طور پر انگریزی کو منتخب کیا۔ اتفاق کی بات کہ انتہائی مشقت کے بعد جب علیم صاحب نے انگریزی ادب کی تاریخ پر مقالہ تیار کرلیا تو اسے جمع کرنے سے قبل ہی نگراں پروفیسر کا انتقال ہوگیا۔ تب تاریخ کے پروفیسر کی صلاح پر انہوں نے قرون وسطی کے یوروپی ممالک کی تاریخ کا مطالعہ شروع کیا، اور اسلامی ممالک سے یوروپ کے روابط پر خصوصی توجہ مبذول کی۔ تقریباً تین سال کے عرصہ میں پی ایچ ڈی حاصل کرکے علیم صاحب ۱۹۳۲ء میں ہندوستان واپس آگئے تھے۔

برلن میں قیام کے دوران علیم صاحب ''انڈین ایسوسی ایشن آف سینٹرل یوروپ'' کے صدر منتخب ہوئے، ڈاکٹر رام منوہر لوہیا اس کے سکریٹری تھے۔ یہ ہندوستانی طلبا کی ایک تنظیم تھی جس کا مقصد جرمنی اور پڑوسی ممالک میں ہندوستانی جنگ آزادی کی حمایت میں رائے عامّہ کو ہموار کرنا تھا۔ ابتدا میں علیم صاحب کی ذہنیت پر گاندھی واد کا اثر تھا، بعد میں وہ سوشلزم سے متعارف ہوئے اور وطن واپس آتے آتے پوری طرح سوشلسٹ بن گئے۔ ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب کی تحریک پر وہ برائے نام مشاہرے پر استاد کی حیثیت سے جامعہ ملیہ سے وابستہ ہوگئے جہاں پینتالیس روپے ماہانہ تنخواہ کی ادائیگی بھی کئی کئی ماہ تک نہیں ہو پاتی تھی۔ جب یہ طے ہوا کہ ماہنامہ 'جامعہ' ۱۹۳۴ء کے آغاز سے ایک نئی ترتیب کے ساتھ شائع ہوا کرے گا جس میں سال کے بارہ شماروں میں سے چار اسلامیات، چار اجتماعیات اور چار ادبیات کے لیے مخصوص ہوں گے تو مجلس ادارت کی ازسرِنو تشکیل ہوئی، ڈاکٹر ذاکر حسین، پروفیسر محمد مجیب اور ڈاکٹر عبدالعلیم کو اس میں شامل کیا گیا۔ ۱۹۳۳ء میں جامعہ میں ایک مباحثے کا آغاز ہوا جس کا عنوان تھا ''جامعہ اپنے مقصد سے ہٹتی جارہی ہے''۔ تقاریر کا آغاز ہوا تو علیم صاحب نے یہ شوشہ چھوڑ دیا کہ آج کے موضوع پر بحث کرنا اس وقت آسان ہوگا جب پہلے یہ معلوم ہوجائے کہ جامعہ کا مقصد ہے کیا؟ کوئی مقرر اس پر بولنے کو تیار نہ ملا تو علیم صاحب نے اپنی خدمات پیش کیں۔ جو شخص بے حد کم گو مانا جاتا تھا اس نے مسلسل دو اجلاس میں مقصد جامعہ پر تقریر کی، تیسرے دن بھی بولنا چاہا مگر صدر جلسہ نے اجازت نہیں دی۔ مباحث کا یہ روزانہ سلسلہ تقریباً سوا دو ماہ تک جاری رہا۔[۱]

ایک عرصہ تک علیم صاحب یونیورسٹی گرانٹس کمیشن کے رکن رہے۔ وہ یو جی سی کی اس سہ رکنی کمیٹی میں بھی شامل تھے جو جامعہ ملیہ اسلامیہ کی مالی ضرورتوں کا جائزہ لینے کے لیے تشکیل دی گئی تھی۔ اس کمیٹی کی سفارشات نے جامعہ کو بہت فیض پہونچایا۔ اکتوبر ۱۹۳۴ء میں جامعہ کی ملازمت سے مستعفی ہوکر علیم صاحب علیگڑھ مسلم یونیورسٹی کے شعبۂ عربی میں کام کرنے لگے۔ تاہم اُن دنوں بھی وہ جامعہ ملیہ اسلامیہ کی مجلس عاملہ میں اور مکتبہ جامعہ کے بورڈ آف ڈائرکٹرس میں شامل رہے۔ ایک مرتبہ بورڈ کی میٹنگ میں یہ تجویز پیش کی گئی کہ اراکین بورڈ کے زیر ولایت ان طلبا کو جو جامعہ ملّیہ میں زیر تعلیم ہیں، کورس کی کتابیں اور کاپیاں مکتبہ جامعہ کی جانب سے مفت فراہم کی جائیں۔ رقم کے تعیّن پر تبادلۂ خیال کے بعد تجویز کو منظور کرلیا گیا۔ علیم صاحب اس دوران بالکل خاموش تھے، جب دستخط کے لئے کاغذ اُن کے سامنے آیا تو بولے: 'درجہ چہارم کے ملازمین کو تو یہ سہولت مل ہی رہی ہوگی؟' اس ایک غیر رسمی سوال نے پورا منظرنامہ تبدیل کردیا۔ آخر کار مذکورہ بالا تجویز کے بجائے یہ منظور ہوا کہ یہ سہولت درجہ چہارم کے ملازمین کو دی جائے گی۔

علیگڑھ میں محض ڈھائی تین برس قیام کے بعد ۱۹۳۷ء میں وہ لکھنؤ یونیورسٹی کے شعبۂ عربی سے منسلک ہوگئے اور تیرہ برس درس و تدریس میں مصروف رہے۔ ان ہی دنوں سجاد ظہیر اور کرشن چندر کی معیت میں 'انجمن ترقی پسند مصنّفین' کی تشکیل ہو چکی تھی۔ لکھنؤ یونیورسٹی میں بائیں بازو سے متعلق اساتذہ ان کے گرد جمع ہوگئے اور انہیں ٹیچرس ایسوسی ایشن میں بھی اہم مقام حاصل رہا۔ قیام لکھنؤ کے دوران انکا ذریعۂ آمدورفت تانگہ رہا یا سائیکل، رکشا کی سواری سے ہمیشہ گریز کیا۔ بعد میں انہوں نے اپنا ایک گھوڑا تانگہ خرید لیا جسے وہ خود ہی چلاتے بھی تھے۔ آنکھوں دیکھی سناتے ہوئے ڈاکٹر ابن فرید فرماتے ہیں کہ علیم صاحب ہمیشہ تانگے کی پچھلی سیٹ پر بیٹھ کر لگام اپنے ہاتھ میں لے لیتے تھے۔ تانگہ چلانے کا انداز یہ ہوتا تھا کہ نصف زاویہ سے آگے مڑے ہوتے اور سگار منہ میں دبا ہوتا تھا۔ سائیس بے چارہ ڈمی کی حیثیت سے آگے والی سیٹ پر بیٹھا رہتا تھا۔ علیم صاحب کے پاس ایک خوبصورت سی نیم پلیٹ (نام کی تختی) تھی جس پر نیلے رنگ سے انگریزی میں عبدالعلیم لکھا ہوا تھا۔ لکھنؤ میں جہاں بھی رہے یہ نیم پلیٹ صدر دروازے کی زینت بنی۔ دوبارہ علیگڑھ آنے پر یہی پلیٹ یونیورسٹی روڈ کی کوٹھی نمبر ۳ کے گیٹ پر آویزاں ہوئی، وائس چانسلر بن گئے تو اس کی کوئی ضرورت نہ رہی مگر جب دلّی آئے تو شانتی پتھ کے موتی باغ والے مکان پر پھر یہی پلیٹ نظر آئی۔[۴]

علیم صاحب 'انجمن ترقی پسند مصنّفین' کے بانیوں میں سے ایک تھے۔ ۱۹۳۶ء میں انجمن کا پہلا منشور اور ۱۹۵۳ء میں دوسرا منشور تیار کرنے میں ان کا کردار کلیدی تھا۔ انجمن کی دہلی کانفرنس (۱۹۴۲ء) میں فاشزم کے خلاف اور حیدرآباد کانفرنس (۱۹۴۵ء) میں فاشی کے خلاف ریزولیشن بھی وہی لائے۔ ان کا ذہن منطقی تھا اور وہ کم سے کم الفاظ میں زیادہ سے زیادہ بات کہنے اور حالات کا معروضی تجزیہ کرنے کی اچھی صلاحیت رکھتے تھے، اسی لیے کانفرنسوں کی قرارداد اور روداد لکھنے کی ذمہ داری بھی انہی پر آتی تھی۔ علیم صاحب نے ترقی پسند ادب پر بھی کڑی تنقید کی اور کمیونسٹ پارٹی کی حمایت بھی آنکھ بند کرکے نہیں کی۔ وہ ہر محاذ پر اپنے بے باک مشوروں کے لیے مشہور تھے۔ علیم صاحب کی بے باکی اور صاف گوئی کا ایک واقعہ اس وقت پیش آیا جب ۱۹۴۵ء میں جے پور کی PEN کانفرنس کے موقع پر ڈاکٹر ملک راج آنند نے یہ تجویز پیش کی کہ زبان کے معیار کی حفاظت کے لیے ہندوستان میں بھی فرانسیسی قاموسیوں (انسائیکلوپیڈسٹ) کے طرز پر ایک تحریک کا آغاز کیا جائے۔ بیشتر حاضرین نے تجویز کی حمایت کی مگر ڈاکٹر عبدالعلیم نے اس کی مخالفت کی۔ انہوں نے مجمع پر نظر ڈال کر کہا کہ فرانس میں تو اس تحریک کو چلانے والوں میں روسو اور والٹیر جیسے عظیم مفکر موجود تھے مگر یہاں تو مجھے کوئی بھی اس پایہ کا دکھائی نہیں دیتا ہے، ایک جانب سے آواز آئی، ''کیا اُدھر ڈائس پر بھی نہیں؟'' علیم صاحب نے ڈائس پر نگاہ ڈالی جہاں جواہر لال نہرو، رادھا کرشنن، سروجنی نائیڈو، ہرمن اولڈ، ملک راج آنند، ای۔ ایم۔ فارسٹر اور احمد شاہ بخاری پطرس جیسے زعما موجود تھے، پھر مجمع کی طرف مڑ کر بولے ''نہیں، اُدھر بھی نہیں''۔ آخر کار وہ تجویز مسترد ہوگئی۔[۳]

آخر میں علیم صاحب انجمن ترقی پسند مصنفین کی تنظیم پر توجہ کم کرکے اردو ادیبوں کی ایک ایسی کل ہند انجمن بنانے پر زور دینے لگے تھے جس میں اراکین کے سیاسی، مذہبی اور معاشی نظریہ سے کوئی سروکار نہ رکھا جائے۔ ۱۹۵۷ء میں گیا (بہار) کے ایک اجلاس میں مختلف زبانوں کی ادبی انجمنوں کی ایک فیڈریشن قایم کی گئی تو بے حد علالت کے باوجود بھی علیم صاحب اس کے افتتاح کے لیے تشریف لے گئے۔ علیم صاحب کی ادبی اور صحافتی خدمات بھی بہت نمایاں ہیں۔ وہ مختلف اوقات میں ماہنامہ جامعہ، ماہنامہ نیا ادب، ماہنامہ منزل، ہفت روزہ ہندوستان اور انگریزی ماہنامہ نیو انڈین لٹریچر کی ادارت سے وابستہ رہے۔ ہفت روزہ ہندوستان کے تو وہ منیجنگ ڈائرکٹر بھی تھے اور یہ جریدہ انہی کے گھر سے نکلتا تھا۔ اس کے بورڈ آف ڈائرکٹرس میں آچاریہ نریندر دیو اور رفیع احمد قدوائی جیسے قدآور لوگ شامل تھے اور حیات اللہ انصاری اس کے مدیر تھے۔ علیم صاحب نے اردو ادب میں کئی اصطلاحیں (مثلاً شہ سرخی، سلامتی کونسل وغیرہ) وضع کیں اور اردو املا میں کئی تبدیلیاں (مثلاً ہندوستان کی جگہ ہندستان، پہونچ کی جگہ پہنچ اور علیحدگی کی جگہ علاحدگی) قایم کیں۔

تقسیم وطن کے بعد جب علیگڑھ مسلم یونیورسٹی کے وجود پر خطرات کے بادل چھانے لگے تو پنڈت جواہر لال نہرو نے ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب کو شیخ الجامعہ بنا کر علیگڑھ بھیجا۔ ذاکر صاحب نے مخلص مشیروں کا ایک گروپ بنانا چاہا تو انہیں علیم صاحب کی یاد آئی۔ اتفاق سے اسی اثنا میں کشمیر یونیورسٹی کے شعبۂ عربی کی سربراہی بھی علیم صاحب کو پیش کی گئی تھی۔ مگر جب ذاکر صاحب نے یہ لکھا کہ ''ہمارا حق آپ پر زیادہ ہے'' تو علیم صاحب نے کشمیر یونیورسٹی کی پروفیسری اور ہیڈشپ کو پس پشت ڈال کر علیگڑھ میں ریڈر کی حیثیت قبول کرلی۔ اس طرح ۱۹۵۰ء میں وہ دوبارہ علیگڑھ آگئے۔ انہوں نے شعبۂ عربی کو ایک نئی شکل دی۔ ادارۂ علوم اسلامیہ اور سینٹر آف ویسٹ ایشین اسٹڈیز (مرکز مطالعات ایشیائے غربی) بھی ان ہی کی کوششوں سے قایم ہوئے۔ ان کے زمانے میں شعبہ عربی میں مشہور روسی اسکالر بابا غفوروف، سعید نفیسی اور نیازی برُکس جیسے جیّد علما کی آمد ہوئی۔ پروفیسر بن جانے کے بعد وہ ادارہ علوم اسلامیہ کے ڈائرکٹر بھی ہوگئے۔ چار سال 'احمدی اسکول برائے نابینا طلبا و طالبات' کے منیجر رہے، بعد میں یونیورسٹی کے تینوں ہائی اسکولوں کی نگہداشت بھی ان کے حصے میں آئی۔ انہوں نے آرٹس فیکلٹی کے ڈین اور یونیورسٹی کے رجسٹرار کی حیثیت سے بھی کام کیا۔

۱۹۵۱ء میں جب علیم صاحب کی والدہ محترمہ کا انتقال ہوا تو وہ ان کے پاس ہی موجود تھے، کہا جاتا ہے کہ انہوں نے ماں کی پیشانی پر زعفران سے کلمہ لکھا اور نماز جنازہ بھی خود ہی پڑھائی [۵]۔ لکھنؤ آنے جانے کا سلسلہ اس کے بعد بھی برقرار رہا۔ اُن دنوں روزنامہ نیشنل ہیرالڈ کے تیسرے صفحے پر لکھنؤ شہر میں آنے والی اہم شخصیات کے نام اور مصروفیات کا تذکرہ چھپا کرتا تھا۔ علیم صاحب کا نام جب کبھی اس کالم میں آتا تو گورنمنٹ ہاؤس کی گاڑی ان کو شہر بھر میں ممکنہ مقامات پر ڈھونڈتی پھرتی، چونکہ گورنر گوپالا ریڈی سے دیرینہ مراسم تھے، لہٰذا ریڈی صاحب کی یہی خواہش ہوتی تھی کہ علیم صاحب لکھنؤ آئیں تو گورنمنٹ ہاؤس میں ہی قیام کریں۔[۱]

اکتوبر ۱۹۶۲ء میں بدرالدین طیّب جی نئے شیخ الجامعہ کی حیثیت سے علیگڑھ پہونچے تو انہوں نے سینیر اساتذہ کو زیادہ اہمیت نہیں دی، عبدالعلیم اور نورالحسن جیسے اساتذہ کرام منقار زیر پر آ گئے۔ جنوری ۱۹۶۴ء میں مستشرقین کی ۲۶ ویں بین اقوامی کانفرنس میں علیم صاحب کو شریک ہونا تھا۔ اتفاق سے انہی دنوں شیخ الجامعہ نے ایک عام حکم نامہ جاری کیا کہ کسی بین الاقوامی کانفرنس میں پیش کیا جانے والا مقالہ پہلے ان کو دکھایا جانا ضروری ہے۔ یہ ایک طرح سے سینیر اساتذہ کی توہین تھی مگر سامنے کون آئے؟ علیم صاحب نے وائس چانسلر کو خط لکھ کر آگاہ کیا کہ بنیادی طور پر وائس چانسلری ایک انتظامی عہدہ ہے اور وائس چانسلر علمی اور ادبی کاموں میں مداخلت کا مجاز نہیں ہے۔ میں سیمنار میں اپنی ذاتی حیثیت سے مقالہ پیش کروں گا، اور اسے پہلے سے آپ کو نہیں دکھاؤنگا۔ طیّب جی ایک سمجھدار انسان اور ہوشیار منتظم تھے، انہوں نے اس حکم نامے کے اطلاق کی پھر کبھی کوئی کوشش نہیں کی۔

صدر جمہوریہ ڈاکٹر ذاکر حسین، عبدالعلیم صاحب کے استاد بھی تھے اور دوست بھی، ان ہی کے مشورے پر علیم صاحب برلن گئے، انہی کی ایما پر وہ پہلے جامعہ ملیہ میں اور پھر مسلم یونیورسٹی میں ملازم ہوئے، اور ۱۹۶۸ء میں علیم صاحب کو وائس چانسلر بنانے والے بھی ذاکر حسین ہی تھے۔ انہوں نے پروفیسر خلیق احمد نظامی صاحب کو دلّی بلا کر یہ وعدہ لیا تھا کہ علیم صاحب کی وائس چانسلری کے دوران وہ ان سے پورا تعاون کریں گے۔ نظامی صاحب کی' جو یونیورسٹی میں تاریخ کے ایک نامور استاد اور صدر شعبہ تھے' کیمپس کی سیاست پر گرفت مضبوط تھی اور وہ کمیونزم مخالف گروپ کی نمائندگی کرتے تھے۔ جب علیم صاحب نے نظامی صاحب کو سرسید ہال کا پرووسٹ بنانا چاہا اور نظامی صاحب نے معذرت کا اظہار کیا تو علیم صاحب نے انہیں یاد دلایا کہ ''آپ نے کسی سے میری مدد کا وعدہ کیا تھا''۔ نظامی صاحب کو آمادہ ہونا پڑا، بعد میں ان کو نائب شیخ الجامعہ کا عہدہ بھی دیا گیا۔[۸]

مسلم یونیورسٹی کے اساتذہ میں سے وائس چانسلر منتخب ہونے کا شرف ۲۰۱۷ء تک صرف علیم صاحب کو ہی حاصل تھا، موجودہ شیخ الجامعہ پروفیسر طارق منصور اب ایسے دوسرے خوش نصیب ہو گئے ہیں۔ علیم صاحب کے سرخ نظریات سے یونیورسٹی برادری کا ایک بڑا طبقہ بیزار تھا۔ علیم صاحب نے اپنے استقبالیہ جلسے میں اس بات کی وضاحت بھی کر دی تھی کہ وہ کچھ مخصوص نظریات کے حامل ہیں مگر وہ نظریات ان کے فیصلوں پر اثر انداز نہیں ہونگے۔ اور ہوا بھی یہی، انہوں نے کبھی اپنی پوزیشن کا ناجائز استعمال نہیں ہونے دیا بلکہ اس درجہ محتاط رہے کہ ان کے قریبی لوگ خسارے میں رہ گئے۔ ان کی صاحبزادی (جمیلہ صدیقی) جو امریکہ سے پی۔ایچ۔ڈی کر کے آئی تھیں، علیم صاحب کے انتقال تک d emonstrator کی اسی پوزیشن پر برقرار رہیں جس پر طیّب جی کے زمانے میں ان کا تقرر ہوا تھا۔ ان کے صاحبزادے عبدالحلیم صاحب جو علی یاور جنگ کے زمانے میں لیکچرر ہو گئے تھے، باپ کے دور اقتدار میں ریڈر بھی نہ بن سکے۔ ان کے داماد' عبدالماجد صدیقی صاحب کے مقابلے میں فضل الرحمان صاحب کو، جو نسبتاً سینیر بھی تھے، ترقی دی گئی۔ کہا جاتا ہے کہ اس موقع پر علیم صاحب کی یہ ہدایت تھی کہ امیدواروں کی سینیارٹی (عرصہ ملازمت) کو نظر انداز نہ کیا جائے۔

ایک خانگی وجہ بھی علیم صاحب کی مخالفت میں اضافے کا باعث بتائی جاتی ہے، چونکہ وائس چانسلر بننے سے پہلے بھی علیم صاحب یونیورسٹی برادری کے رکن تھے اور خوش اخلاق وملنسار بھی تھے لہٰذا سبھی رفقائے کار سے اچھے مراسم تھے۔ جب وہ وائس چانسلر بنے اس وقت تک ان کے صاحبزادے حلیم اور چھوٹی بیٹی وسیمہ کی شادی نہیں ہوئی تھی، لہٰذا جیسے ہی انہوں نے تاج وتخت سنبھالا، یونیورسٹی کے بہت سے خواص ان کے گھرانے سے رشتہ جوڑنے کی سوچنے لگے۔ بیٹوں کے والدین کو وسیمہ میں ایک مثالی بہو کی صفات نظر آنے لگیں اور جن کے گھروں میں بیٹیاں تھیں ان کے ذہن میں ڈاکٹر حلیم کی تصویر جھلملانے لگی۔ شدت التفات سے گھبرا کر خانگی صلاح ومشورے کے بعد جب علیم صاحب نے یہ واضح کر دیا کہ وہ کسی ایسے گھرانے سے رشتہ قایم نہیں کریں گے جس کا تعلق علیگڑھ سے ہوگا' تو کئی ایسے کرم فرما بھی جو اٹھتے بیٹھتے ابھی تک علیم صاحب کا دم بھرتے تھے، اچانک مخالفین کی صف میں شامل ہو گئے -[۵]

علیم صاحب کے زمانے میں سرسید علیہ الرحمۃ کے مکان کی تعمیر نو کی ابتدا بھی ہوئی اور تکمیل بھی۔ ان ہی کے زمانے میں طب یونانی میں پوسٹ گریجویٹ تعلیم کا آغاز ہوا۔ میڈیکل کالج کے قیام وفروغ میں بھی ان کا نمایاں حصہ رہا۔ ۱۹۶۹ء میں انہوں نے سرسیّد میموریل لیکچر کی بنیاد ڈالی۔ ''کل ہند اسلامک اسٹڈیز کانفرنس'' کا سلسلہ بھی انہوں نے شروع کیا تھا اور اس کے کئی اہم اجلاس ملک کے مختلف شہروں میں منعقد کرائے لیکن علیم صاحب کے بعد کانفرنسوں کا یہ سلسلہ بھی دم توڑ گیا۔ اسلامیات کے فروغ کے لیے ایک 'بے دین' کے قایم کردہ اس صحتمند اور دُوررس عمل کو دین داروں کی ٹولی قایم نہ رکھ سکی۔ مسلم یونیورسٹی میں درجہ چہارم کی ملازمت ان دنوں عارضی ہوا کرتی تھی۔ علیم صاحب نے ایسے تمام ملازمین کو جو ایک سال سے زیادہ عرصہ سے کام کر رہے تھے مستقل کر دیا اور پھر باقاعدہ قانون بنا کر اس ملازمت کو بھی مستقل ملازمت کا درجہ دے دیا۔ علاوہ ازیں پانچ فیصد ملازمتیں خواتین کے لیے مخصوص کر دیں۔ انہوں نے اپنے دَور اقتدار میں پانچ کانووکیشن کرائے جن میں جے پرکاش نرائن، جسٹس بی بی گجیندر گڈکر، ڈاکٹر تارا چند، جسٹس محمد ہدایت اللہ اور ڈاکٹر بی گوپالا ریڈی جیسے زعمائے وقت نے شرکت فرمائی۔ اس اثنا میں وہ جامعہ اردو کے بھی سربراہ رہے۔ علیم صاحب کی وائس چانسلری کے تین برس بڑے مزے میں گزرے، آخری سالوں میں انتشار رہا۔ مگر یہ کوئی عجیب بات بھی نہیں، آخری دو برس تو علیگڑھ میں سبھی وائس چانسلروں کو بھاری پڑتے ہیں۔ علیم صاحب چونکہ فطرتاً شفیق اور نرم خو تھے، بہت سے مطالبات کو وہ آسانی سے مانتے گئے۔ اس سے کچھ بدنظمی بھی پیدا ہوئی۔ جنوری ۱۹۷۴ء میں مقرّرہ مدّت سے دور روز قبل مستعفی ہو کر انہوں نے یونیورسٹی کی سربراہی نائب شیخ الجامعہ (پروفیسر خلیق احمد نظامی) کو سونپ دی تھی۔

بلند اخلاقی، غیر جانبداری، رحم دلی اور غریب پروری علیم صاحب کی شخصیت کے نمایاں اور روشن ترین پہلو تھے۔ کسی کی غلطی پر برہمی اور ناگواری کا اظہار تو فرماتے مگر سزا دینے سے کتراتے تھے، یہاں تک کہ بہت دباؤ کے باوجود انہوں نے اس شخص کو بھی نوکری سے برطرف کرنا مناسب نہ سمجھا جس نے ان کے نواسے کو وی سی لاج سے اغوا کر لیا تھا۔ ایک مرتبہ کچھ حضرات نے ابن فرید اور کبیر احمد جائسی صاحبان کو (جب وہ جامعہ اردو میں ملازم تھے) ملازمت سے برطرف کر دینے کی مہم چلائی۔ جب ان حضرات کی کارکردگی میں کوئی خامی نظر نہ آئی تو ان کی جماعتی وابستگی کو وجہ اعتراض بنایا گیا۔ جامعہ اردو کی مجلس عاملہ میں یہ مسئلہ رکھا گیا۔ اس سے پہلے کہ بحث کا آغاز ہوتا، علیم صاحب نے فرمایا کہ کسی جماعت سے وابستگی اگر سبب اخراج بن سکتی ہے تو سب سے پہلے شیخ الجامعہ (کرنل بشیر حسین زیدی) کو اور پھر مجھے مستعفی ہو جانا چاہئے تبھی کسی اور کے بارے میں بات کی جا سکتی ہے۔ انجام کار اس مسئلے کو ایجنڈا سے خارج کرنا پڑا[۴]۔ اس زمانے میں ملازمین کی تنخواہ کا چیک صدر شعبہ کے نام آیا کرتا تھا جسے کیش کرا کے ماہانہ تنخواہ تقسیم کی جاتی تھی۔ بینک سے رقم بحفاظت شعبہ جات تک لانے کے لیے چپراسی کے ساتھ ایک اور شخص کو بھیجا جاتا تھا۔ ایک مرتبہ چپراسی کے ہمراہ دفتر کسی دوسرے آدمی کو نہ بھیج سکا۔ اور اتفاق سے اسی مرتبہ کیش حاصل کرنے کے بعد تمام رقم چپراسی کے پاس سے چوری ہو گئی، معاملہ جو بھی رہا ہو لیکن علیم صاحب نے نہ تو چپراسی کو قصوروار ٹھہرایا اور نہ ہی دفتر کے عملے کو' بلکہ تمام ذمّہ داری خود قبول کرتے ہوئے اپنے گھر کا بہت سا سامان فروخت کر کے چیک کی رقم

فراہم کی اور ادائیگی کا انتظام کرایا۔[۹]

ایک مرتبہ یونیورسٹی لائبریری کے ملازم اور علیم صاحب کے نادار پڑوسی جناب مشتاق حسین کو کینسر کے علاج کے سلسلے میں دلّی کے آل انڈیا انسٹی ٹیوٹ آف میڈیکل سائنسز میں داخل ہونا پڑا۔ مرض میں کوئی افاقہ نہ ہوا اور مشتاق صاحب کی طبیعت بہت گھبرائی تو وہ وہاں سے نکل بھاگے اور ٹیکسی پکڑ کر علیگڑھ آگئے۔ گھر میں اتنے بھی پیسے نہ تھے کہ کرایہ کی ادائیگی کرسکیں، دوڑے دوڑے علیم صاحب کے پاس آئے اور صورت حال سے آگاہ کیا۔ کہا جاتا ہے کہ بقرعید پر اپنے نام کی قربانی کے لیے رکھے ہوئے چار سو روپے علیم صاحب نے ان کے حوالے کردیے۔ چند روز بعد ہی مشتاق صاحب کا انتقال ہوگیا۔ علیم صاحب نے ہی ان کی تجہیز وتکفین کا انتظام کیا۔ بعد میں ان کے بیٹے کی تعلیم کو جاری رکھا اور اسے یونیورسٹی میں ملازمت بھی دلوائی۔[۱۰]

اس زمانے میں یونیورسٹی کی مجلس عاملہ میں دو واضح گروپ ہوا کرتے تھے، مسلم گروپ کے سربراہ پروفیسر محمد عمرالدین تھے جبکہ کمیونسٹ گروپ کی سربراہی علیم صاحب اور نورالحسن صاحب کے درمیان بٹی ہوئی تھی۔ تمام اختلافات کو بالائے طاق رکھتے ہوئے جب عمرالدین صاحب نے عبدالحق انصاری صاحب کے روزگار کے سلسلے میں علیم صاحب کو خط لکھا تو علیم صاحب نے ادارۂ علوم اسلامیہ کے لیے پروفیسر انصاری صاحب کو منتخب کرلیا۔ ڈاکٹر ابن فرید فرماتے ہیں کہ جب عمرالدین صاحب کا انتقال ہوا تو نماز جنازہ میں میرے بائیں جانب عبدالعلیم صاحب نیت باندھے کھڑے تھے۔

کبھی کبھی علیم صاحب کے جملوں میں ظرافت کی جھلک بھی نظر آتی تھی، مثلاً ایک طالب علم ان سے ملنے آیا اور کہنے لگا کہ میرا داخلہ تو ہوگیا ہے مگر ہوسٹل نہیں ملا ہے، مجھے ایک سیٹ الاٹ کردیجیے، علیم صاحب نے اسے بتایا کہ اس سلسلے میں پرووسٹ اور ڈی ایس ڈبلو صاحبان سے ملو۔ لڑکا بولا 'ان سے میں مل چکا ہوں، کہیں جگہ خالی نہیں ہے'۔ جس ہوسٹل میں الاٹمنٹ رُکا ہوا ہے، اس میں مجھے رکھ دیجیے، وہ تو آپ ہی کرسکتے ہیں، ''کون سے ہوسٹل میں؟'' علیم صاحب نے دریافت کیا، ''سر، منٹو ای میں'' لڑکے نے فوراً جواب دیا۔ علیم صاحب سمجھ گئے کہ اسے سینیر طلبا نے بےوقوف بنا کر یہاں بھیجا ہے کیونکہ یہ تو یونیورسٹی کے قبرستان کا نام تھا۔ علیم صاحب مسکرا کر بولے ''وہ ممکن نہیں ہے، ابھی تو وہاں کا پرووسٹ بھی مقرر نہیں ہوا ہے''۔[۱۱]

ایک بار بقرعید کے موقع پر شعبۂ عربی کے تمام اسٹاف کی علیم صاحب کے گھر پہ دعوت تھی۔ اہالیان لکھنؤ کا ذکر چلا تو کسی نے کہا کہ پروفیسر نسیم قریشی صاحب (اردو کے ایک نامور استاد) جب لکھنؤ میں تھے تو (مسلم لیگ سے وابستگی کے باعث) ان کو ایک رات تھانے میں رہنا پڑا تھا۔ علیم صاحب بولے ''مولوی اشرف علی تو ساری عمر تھانے میں رہے'' (مشہور عالم دین اشرف علی تھانویؒ کا تعلق اتر پردیش میں ضلع مظفرنگر کے قصبہ تھانہ بھون سے تھا) [۱۲]۔ مولانا عبدالسلام قدوائی ندوی سے نقل ہے کہ وائس چانسلر بن جانے کے بعد جب علیم صاحب مرکزی وزیر تعلیم سے ملنے گئے' جنکا تعلق بنگال سے تھا' تو وزیر موصوف نے اپنے مخصوص لہجے میں ان سے کہا ''لوگ کہتا ہے کہ آپ کمیونسٹ ہے''۔ علیم صاحب کا برجستہ جواب تھا: ''لوگ ٹھیک کہتا ہے''۔

علیم صاحب ایک فعال مجاہد آزادی بھی تھے۔ لہٰذا تحریک خلافت سے وابستہ رہے، غیر ملکی سامان کا بائیکاٹ کیا۔ یوروپ میں آزادئی ہند کے بارے میں رائے عامّہ ہموار کی۔ سرکاری وظیفہ چھوڑا۔ کھدّر کا لباس اختیار کیا۔ کانگریس کے سالانہ اجلاسوں میں ہمیشہ شرکت کی، جے پرکاش ناراین کے ساتھ کانگریس سوشلسٹ پارٹی قایم کی۔ پنڈت نہرو اور رفیع احمد قدوائی کے ہفت روزہ ''ہندستان'' کی سربراہی کی۔ کمیونسٹ پارٹی کی لکھنؤ شاخ کے سکریٹری اور ریاستی مجلس عاملہ کے رکن رہے اور بھارت چھوڑو تحریک کے سلسلے میں ڈیفنس آف انڈیا رولز کے تحت گرفتار ہوکر لکھنؤ اور آگرہ کی جیلوں میں رہے۔ آگرہ جیل میں جواہرلال نہرو اور سروجنی نائیڈو کا ساتھ رہا۔ علیم صاحب محض ڈرائنگ روم والے کمیونسٹ لیڈر نہیں تھے بلکہ موصوف لال جھنڈا اٹھائے ریلوے مزدوروں کے جلوس میں بھی شامل دیکھے جاتے تھے۔[۱]

بہرکیف کمیونسٹ پارٹی کے دو حصوں میں تقسیم ہوجانے کے بعد سیاست میں علیم صاحب کی دلچسپی ختم ہوگئی۔ آزادی کے بعد مغربی ایشیا کے مسلم ممالک اور بعض افریقی ممالک سے تعلقات کی استواری کا کام ذاکر حسین اور عبدالعلیم صاحبان کو سونپا گیا۔ جو کام حکومتی سطح پر مولانا ابوالکلام آزاد کرتے تھے اسی کو سماجی سطح پر انہیں کرنا تھا۔ اس کام کا مرکز ''انڈین اسکول آف انٹرنیشنل اسٹڈیز'' کے نام سے دلّی کے سپرو ہاؤس میں قایم کیا گیا۔ اس کے سربراہ تو ہردے ناتھ کنزرو تھے' لیکن اصلاً یہ نہرو جی کا ادارہ تھا جہاں مغربی ایشیا کے ممالک سے رشتوں کی منصوبہ بندی کی جاتی تھی۔ علیم صاحب اس ادارے کی مجلس عاملہ کے رکن تھے اور اعزازی پروفیسر کی حیثیت سے ہفتے میں ایک بار لیکچر بھی دیا کرتے تھے۔ ادارے کا افتتاحی خطبہ بھی ۴ فروری ۱۹۵۶ء کو علیم صاحب نے ہی پیش کیا تھا جو عالم عرب کی ڈیرھ سو سالہ کشمکش پر مرکوز تھا۔ اسی ادارے نے بعد میں جواہرلال نہرو یونیورسٹی کی شکل اختیار کی۔ یہ حقیقت ہے کہ جواہر لال نہرو کے زمانے کی خارجہ پالیسی ابوالکلام آزاد، ذاکر حسین اور عبدالعلیم ہی کی کوششوں کا نتیجہ تھی۔

نہرو خاندان سے علیم صاحب کے اچھے تعلقات تھے۔ جواہرلال نہرو سے ان کے مراسم بہت عمدہ رہے، مسز اندرا گاندھی بھی ان کی عزت کرتی تھیں۔ سنجے گاندھی کی شادی میں، جو محمد یونس (مرحوم) کے گھر سے ہوئی تھی محض گیارہ لوگوں کو مدعو کیا گیا تھا جن میں سے ایک علیم صاحب بھی تھے۔ ایک بار جامعہ اردو کا ایک خصوصی جلسہ دلّی یونیورسٹی کے شنکر ہال میں منعقد ہوا جسمیں وزیراعظم اندرا گاندھی مہمان خصوصی کی حیثیت سے موجود تھیں۔ اختتام جلسہ پر جب لوگ جانے لگے تو علیم صاحب ابھی ہال کے وسط میں ہی پہنچے تھے کہ وزیراعظم کا حفاظتی عملہ لوگوں کو راستے سے ہٹانے لگا۔ جب وہ لوگ علیم صاحب کی طرف بڑھے تو اندرا جی نے تیزی سے پیشقدمی کرکے انہیں روکا، آگے بڑھ کر علیم صاحب کو سلام کیا اور مزاج پرسی کرتے ہوئے ساتھ ساتھ چلنے لگیں۔ علیم صاحب نے اپنی آہستہ خرامی کے پیش نظر مسز گاندھی سے کہا کہ آپ تشریف لے چلیں، آپ کے حفاظتی عملے کو پریشانی ہو رہی ہوگی۔ لیکن اندرا جی نے فرمایا یہ کیسے ممکن ہے کہ آپ سے آگے نکل جاؤں، لہٰذا آہستہ آہستہ چلتے ہوئے وہ دروازے تک ان کے ساتھ آئیں اور علیم صاحب جب اپنی کار کی جانب بڑھ گئے تب ہی وزیراعظم نے اپنی سواری کا رُخ کیا۔[۱۱]

علیگڑھ کو خیرباد کہنے کے بعد علیم صاحب نے دلّی میں بیورو فار پروموشن آف اردو (ترقی اردو بورڈ) کے چیرمین کی ذمہ داری سنبھالی۔ وہ بورڈ کے پہلے ایسے چیرمین تھے جو مرکزی حکومت کے وزیر نہ تھے۔ اس حیثیت سے انہوں نے کئی اہم کام کیے، مثلاً فرہنگ آصفیہ چھاپی، اردو انگریزی لغات اور انسائیکلو پیڈیا کا کام شروع کیا، مختلف علوم کی اصطلاحات کے اردو متبادلوں پر کتابیں تیار کرائیں، دلّی اور دیگر اردو علاقوں میں کتابت کے اسکول کھولے، اور اردو املا کی معیار بندی کے کام کو پورا کیا۔ جب ان کو مہاراشٹر کا گورنر بنانے کی بات چلی تو انہوں نے واضح کردیا کہ وہ اردو کی خدمت کو ترجیح دیں گے اور ترقی اردو بورڈ سے وابستگی پر مطمئن ہیں۔ اردو زبان کے تحفّظ وفروغ کے سلسلے میں بنائی گئی گجرال کمیٹی کے بھی وہ ایک فعّال رکن تھے۔ فروری ۱۹۷۶ء کے دوسرے ہفتے میں ترقی اردو بورڈ کے ایک جلسے کے سلسلے میں علیم صاحب چنڈی گڑھ گئے۔ دلّی واپسی پر مخطوطات کمیٹی کے جلسے کی صدارت کی اور جامعہ ملیہ کے ایک سیمنار میں شرکت فرمائی، ۱۶ فروری کو وہ اسپتال میں داخل ہوگئے اور ۱۸ فروری کو داعیٔ اجل کو لبیّک کہدیا۔ اگلے روز علیگڑھ مسلم یونیورسٹی کے قبرستان ''منٹو ای'' میں تدفین عمل میں آئی۔

مَیں اُن دنوں باٹنی میں ریسرچ کا طالب علم تھا اور وقار الملک ہال کے جوبلی ہوسٹل میں رہتا تھا۔ جیسے ہی یونیورسٹی میں علیم صاحب کے انتقال کی خبر پھیلی، پورا کیمپس سوگوار ہوگیا۔ یہ احساس بڑا جان لیوا تھا کہ کچھ عرصہ قبل تک جو شخص ہماری درسگاہ کا حاکم اعلیٰ تھا اور اپنی خوش خلقی کے باعث طلبا کی اکثریت میں مقبول تھا، آج وہ چار کاندھوں پر سوار ہوکر یونیورسٹی آرہا تھا۔ ہر طرف سے طلبا، اساتذہ اور دیگر متعلقین کے غول کے غول اُمڈ پڑے۔ اتنا بڑا جلوس جنازہ شاید ہی علیگڑھ نے کبھی پہلے دیکھا ہو! وہ لوگ بھی موجود تھے جو علیم صاحب کے ذاتی نظریات

سے شدید اختلاف رکھتے تھے۔ یونیورسٹی میں دینیات کے ایک سابق استاد اور علیم صاحب کے ہم نام شاگرد، پروفیسر عبدالعلیم خاں صاحب (مرحوم) ایک جگہ فرماتے ہیں:

"مجھے یاد نہیں پڑتا کہ علیم صاحب نے کبھی اسلام کے خلاف کوئی بات کہی ہو، یا (وجود) خدا کا انکار کیا ہو، یا رسول اللہؐ کی شان میں کوئی (نازیبا) بات کہی ہو۔" [۳]

علیم صاحب کی وفات کا تذکرہ کرتے ہوئے علیم صاحب کے بھانجے اور معروف مصنف عابد سہیل صاحب (مرحوم) فرماتے ہیں: "ان کے سرہانے کی الماری میں قرآن ہمیشہ موجود رہا، اور اکثر تکیہ کے پاس بھی رکھا دیکھا گیا"۔ [۳]

ایک بات یہ بھی تھی کہ اپنی آزاد خیالی کو علیم صاحب نے اپنی ہی ذات تک محدود رکھا اور کبھی اپنے نظریات کسی دوسرے پر تھوپنے کی کوشش نہیں کی یہاں تک کہ اپنے گھر کے حد درجہ مذہبی ماحول میں بھی کبھی کوئی رخنہ اندازی نہیں کی بلکہ حسب سابق مذہبی تقاریب کی سرپرستی بھی جاری رکھی۔ جمیلہ ماجد صدیقی (علیم صاحب کی صاحبزادی) ایک جگہ لکھتی ہیں:

"ابا روزے نہیں رکھتے تھے مگر گھر کے لوگوں کو سحری کے لیے ہمیشہ ابا ہی جگاتے تھے، ڈھائی تین بجے تک پڑھتے رہتے تھے، جب سونے جاتے تو دیکھ لیتے تھے کہ کوئی اٹھ گیا ہے کہ نہیں۔ اگر آہٹ نہ ملتی تو ہمیشہ آپا کو پکارتے "انیسہ بٹیا اٹھ جاؤ، اپنی باجی (والدہ) کو جگاؤ، سحری کھائیں"۔ اس طرح ابا کی موجودگی میں بغیر سحری کا روزہ شاید ہی کبھی کسی نے رکھا ہو۔" [۵]

علیم صاحب کی پھوپھی زاد بہن عائشہ بیگم فرماتی ہیں:

"ماہ رمضان میں وہ کسی کے سامنے کھانے پینے سے گریز کرتے تھے، شام کی چائے، جس کے وہ عادی تھے، افطار کے وقت سب کے ساتھ پیتے تھے۔ روزے نہ رکھنے کا ان کو احساس بھی رہتا تھا اور ہمیشہ اس کا فدیہ دیا جاتا تھا" [۱۳]

علیم صاحب کے انتقال کے بعد بہت سے لوگوں نے انہیں خواب میں دیکھا۔ جمیلہ صدیقی صاحبہ نے بھی اپنے کئی خوابوں کا تذکرہ کیا ہے، مگر باپ کے بارے میں بیٹی کے خواب وخیال کو زیادہ اہمیت نہ دیتے ہوئے میں یہاں ایک ایسے خواب کا ذکر کرنا چاہوں گا جو ایک غیر متعلق شخص نے دیکھا تھا اور جس کے زیر اثر وہ بیگم علیم صاحبہ سے مل کر خواستگار معافی ہوئے تھے۔

جمیلہ صدیقی فرماتی ہیں:

"اسلامک اسٹڈیز ڈپارٹمنٹ میں فضل الرحمان ندوی صاحب یوں تو ابا کی بہت عزت کرتے تھے اور ان کی قابلیت کے معترف بھی تھے لیکن نظریاتی اختلافات کی بنا پر کبھی کسی محفل میں ابا کے خلاف بھی بولتے ہوں گے۔ ایک روز وہ ڈیڑھ بجے دن میں اللہ والی کوٹھی آئے۔ میں باجی کی خیریت لینے اکثر وقت بے وقت وہاں چلی جاتی تھی، دروازہ میں نے ہی کھولا۔ ندوی صاحب نے حلیم کو دریافت کیا تو میں نے بتایا کہ ابھی وہ یونیورسٹی سے واپس نہیں آئے ہیں۔ انہوں نے کہا کہ مجھے بیگم صاحبہ سے ملوا دیجئے۔ میں انہیں ڈرائنگ روم میں بٹھا کر باجی (والدہ صاحبہ) کو بلا لائی۔ باجی کو دیکھتے ہی وہ ان کے سامنے دوزانو ہو کر بیٹھ گئے اور گڑگڑانے لگے کہ مجرم تو میں ڈاکٹر صاحب کا ہوں لیکن اب ان سے کیسے معافی مانگوں۔ آپ معاف کر دیجئے تو اللہ بھی معاف کرے گا۔ باجی نے کہا بات تو بتائیے کیوں اتنا پریشان ہیں۔ کہنے لگے کہ رات میں نے ڈاکٹر صاحب کو خواب میں دیکھا کہ مجھ سے فرما رہے ہیں کہ سولہویں پارے میں فلاں سورۃ کی فلاں آیت حلیم کو بتا دو کہ پڑھا کرے، وہ آج کل بہت پریشان ہے۔ آنکھ کھلنے پر میں نے قرآن کھول کر دیکھا تو واقعی وہ آیت وہاں موجود تھی جس کے معنی پریشانی میں صبر اور توکل سے متعلق تھے۔ یہ خواب بیان کر کے موصوف بری طرح رونے لگے۔" [۵]

کچھ برس پہلے ماہنامہ "اردو دنیا" دہلی کے کسی شمارے میں ایک کتاب "عقیدۂ اعجاز قرآن کی تاریخ" پر تبصرہ چھپا جو علیم صاحب کے برلن یونیورسٹی میں جمع کیے گئے ڈاکٹریٹ مقالے کے اردو ترجمہ پر مشتمل تھی، مجھے یہ کتاب حاصل کرنے کا اشتیاق ہوا کیونکہ ایام طالب علمی سے ہی قرآن کریم سے متعلق علیم صاحب کی منفی تحقیق کے بارے میں زبردست تجسّس دل کے نہاں خانوں میں موجود تھا۔ کتاب پڑھ کر میں بے حد حیران ہوا کیونکہ ان کے اس مقالے کا تو موضوع ہی مختلف نکلا، اس میں تو محض اعجاز قرآن کے عقیدے کی تاریخ کا احاطہ کیا گیا ہے، وہ بھی انتہائی معروضی اور غیر جانبدارانہ انداز میں۔ علیم صاحب نے مسئلے کے حسن وقبح پر بحث کرنے کے بجائے محض اس کے ارتقائی پس منظر کو اجاگر کیا ہے اور ذاتی رجحانات ونظریات کے سائے سے بچتے ہوئے تاریخی جدلیت کی روشنی میں موضوع کا جائزہ لیا ہے۔ اس میں تو کہیں بھی یہ تاثر نہیں ملتا کہ مصنف کو قرآن کی مخالفت مقصود تھی۔ میری تو یہ حیثیت نہیں ہے کہ میں اسلامی موضوعات پر کوئی حتمی رائے پیش کر سکوں مگر مسلم یونیورسٹی میں اسلامیات کے سابق پروفیسر کبیر احمد جائسی صاحب اپنے ایک جامع مضمون میں اس مقالے کے خدوخال پر روشنی ڈالتے ہوئے یوں رقم طراز ہیں:

"پروفیسر عبدالعلیم صاحب کے بارے میں یہ افواہ تاریخی واقعے کا درجہ اختیار کر چکی ہے کہ انہوں نے اپنے تحقیقی مقالے میں قرآن کے منزل من اللہ ہونے سے انکار کیا ہے۔ میں جرمن زبان سے یکسر نابلد ہوں اس لیے ان کے تحقیقی مقالے پر تو کوئی رائے زنی نہیں کر سکتا مگر "عقیدۂ اعجاز قرآن کی تاریخ" کے بارے میں جواب دہی کے احساس کے ساتھ پوری ذمہ داری سے واضح الفاظ میں یہ عرض کرنے کے قابل ضرور ہوں کہ اس اردو کتاب کے کسی بھی لفظ سے نہ تو اسلامی عقائد کی کوئی اہانت ہوتی ہے اور نہ ہی اس میں قرآن کو انسانی کلام ثابت کرنے کی ادنی سی بھی کوشش نظر آتی ہے۔ اس کتاب میں صرف عقیدۂ اعجاز قرآن کی تاریخ انتہائی تحقیقی اور مدلّل انداز سے قلم بند کی گئی ہے اور بطور ضمیمہ ان معارضین قرآن کا بھی ذکر کر دیا گیا ہے جو بزعم خود قرآن کے مقابل آئے مگر کوئی ایسا کلام پیش نہ کر سکے جو قرآن کا پاسنگ ہی ہوتا" [۱۴]

علیم صاحب کے ڈاکٹریٹ مقالے کا اردو ترجمہ ان کی برلن سے واپسی کے تقریباً فوراً بعد سہ ماہی 'جامعۃ' میں شائع ہوا تھا۔ پھر تین چار سال کے بعد علیم صاحب کے استاد اور نامور مفکر ڈاکٹر عابد حسین صاحب کے پیش لفظ کے ساتھ کتابی شکل میں مکتبہ جامعہ سے شائع ہوا۔ مشہور مترجم قرآن محمد پکھتال مرحوم نے اور خود علیم صاحب نے اس کے انگریزی تراجم بھی شائع کیے، تو پھر سوال یہ ہے کہ اس مقالے کے بارے میں اس درجہ غلط فہمی کیوں عام ہوئی؟ اور اس غلط فہمی کی بروقت تردید کیوں نہیں کی گئی؟ ایسا لگتا ہے کہ مخالفین نے افواہ پھیلائی اور علیم صاحب کی خودداری یا ضدی طبیعت نے ان کو صفائی پیش کرنے کی اجازت نہیں دی، انجام کار موصوف کی مسلسل خاموشی نے عام آدمی کو بھی یہ باور کر لینے پر مجبور کر دیا کہ جو کہا جا رہا ہے وہ سچ ہے۔

علیم صاحب کا یہ مقالہ سات سرخیوں (۱۔ دعوے کی ابتدا، ۲۔ عقیدے کی نشوونما، ۳۔ لفظ اعجاز اور اس کا مفہوم، ۴۔ تصانیف، ۵۔ علم المعنی والبیان اور عقیدۂ اعجاز قرآن، ۶۔ دلائل اعجاز، ۷۔ منکرین اعجاز اور معارضین قرآن) پر مشتمل ہے۔ اس کی آخری سرخی کے ذیل میں ان افراد کا ذکر ہے جن کے بارے میں مشہور ہے کہ انہوں نے نبوّت کا دعویٰ کیا یا اپنے کلام کو قرآن کے مقابل قرار دیا۔ مضمون کے اسی حصے میں دوسری صدی ہجری کے وسط کو ایسا زمانہ قرار دیتے ہوئے جس میں آزاد خیالی کی ایک لہر دوڑ گئی تھی علیم صاحب نے ابن المقفع، بشار بن بُرد، صالح بن عبدالقدوس، اور عبدالحمید کاتب کا حوالہ دیا ہے جو اس وقت کے باکمال قلم کار یا شاعر تھے، اور جن کے بارے میں کہا جاتا تھا کہ وہ لوگ اپنی محفلوں میں قرآن پر اعتراضات اٹھانے اور اس کے مثیل کلام پیش کرنے کی کوشش کیا کرتے تھے۔ انہوں نے یاد دلایا کہ عربی ادب کے ابتدائی

دور میں بھی بعض بہترین نثرنگاروں اور شاعروں پر ایسے الزامات لگائے گئے تھے، اور یہ تمام روایتیں اسی ایک نکتے پر ختم ہوئی ہیں کہ تمام کوششوں کے باوجود وہ قرآن کے مقابلے میں کچھ بھی پیش کرنے سے قاصر رہے۔ ان حالات پر تبصرہ کرتے ہوئے علیم صاحب نے لکھا ہے:

''ان تمام افراد کے بارے میں یقینی طور پر معلوم ہے کہ راسخ العقیدہ نہ تھے۔ پھر اس پر طرّہ یہ کہ ان میں سے ہر ایک صاحب طرز نثر نگار یا شاعر تھا۔ غالباً یہی اس الزام کی (کہ وہ قرآن جیسا کلام پیش کرنا چاہتے تھے) اصلی وجہ ہے۔ عوام کا تخیّل ہر زمانے میں بلند پرواز رہا ہے اور یہ امر بھی مسلّم ہے کہ مرور زمانہ افواہ کو تاریخی واقعات اور افسانے کو حقیقت بنا دیتا ہے۔ خصوصاً اعتقادات عامّہ کے مخالفین کی فرد جرم میں تو زمین کی ہر گردش ایک نئے جرم کا اضافہ کر دیتی ہے۔ اس مسئلہ میں شہادت کا جہاں تک تعلق ہے وہ اس کے لیے کفایت نہیں کہ ہم ان ادبا پر اتنا بڑا الزام لگا دیں۔ پھر اس کا بھی لحاظ رہے کہ ابن المقفع اور اس کے دوسرے احباب کا زمانہ وہ زمانہ تھا جب اسلامی عقاید کی تشکیل شروع ہی ہوئی تھی اور ہر مسئلے میں شدید اختلافات کا ہونا لازمی تھا۔ ہم دیکھ چکے ہیں کہ تقریباً اسی زمانے میں اعجاز قرآن کے مسئلے سے پہلی بار بحث کی گئی تھی۔ اس زمانہ میں صاحبان عقل و ہوش کا ایک حلقہ عوام سے الگ قایم تھا اور یہی لوگ اس کے اَرکان تھے، اس لیے لازمی طور پر ان لوگوں کے خیالات عوام کے عقاید سے مختلف رہے ہوں گے۔ رائے عامّہ ہمیشہ متشدّد ہوتی ہے اور اس کی عدالت میں جو شخص پورا مومن نہیں ہوتا وہ پورا کافر قرار پاتا ہے۔ اگر کوئی شخص ایک چیز پر ایمان نہیں رکھتا تو زیادہ امکان اسی کا سمجھا جاتا ہے کہ کسی بھی چیز پر ایمان نہیں رکھتا۔ عوام کی منطق یہی ہے اور اسی سے وہ خواص کی قسمت کا فیصلہ کرتے ہیں۔ پھر ابن المقفع اور اس کے ساتھیوں کو مستثنیٰ کیوں کیا جاتا؟'' [۱۵]

مگر، اس سب کے باوجود، کیا ہی اچھا ہو کہ ہم خود کو اللہ میاں کا نائب سمجھنا چھوڑ دیں، اللہ اور اس کے بندوں کے درمیان تعلق کے معاملے پر خود اللہ کو ہی فیصلہ کرنے دیں، دوسروں کے لیے جنت یا جہنم طے کرنے کے بجائے ہم محض اپنی مغفرت کی فکر کریں اور مولا کیساتھ اپنے تعلق پر توجہ دیں' دوسروں کا احتساب کرنا ہماری ذمہ داری ہے بھی نہیں۔

خداوند کریم علیم صاحب کی روح کو غریق رحمت کرے اور فکری فتنوں، گمراہیوں اور بدگمانیوں سے ہم سب کو محفوظ رکھے!!

☆

حوالے:

۱۔ عابد سہیل (۲۰۰۸): ''عبدالعلیم''۔ ساہتیہ اکادمی۔ نئی دہلی

۲۔ عبیدالرحمان صدیقی (۲۰۱۵): غازی پور میں مولوی عبدالعلیم۔ ماہنامہ تہذیب الاخلاق (علی گڑھ) جولائی، ص ۴۸۔۵۸

۳۔ عابد سہیل (۲۰۰۸): ''عبدالعلیم کی منتخب تحریریں''۔ نیشنل بک ٹرسٹ، انڈیا۔ نئی دہلی

۴۔ ابن فرید (۱۹۹۵): ڈاکٹر عبدالعلیم صاحب (''علیم صاحب''، مرتّبہ محمد سالم قدوائی: صفحات ۱۷۸۔۱۸۴)، ادارہ علوم اسلامیہ۔ علیگڑھ مسلم یونیورسٹی، علیگڑھ

۵۔ جمیلہ ماجد صدیقی (۱۹۹۵): ہمارے ابّا (''علیم صاحب'' مرتّبہ محمد سالم قدوائی: صفحات ۱۹۔۵۱)، ادارہ علوم اسلامیات۔ علیگڑھ مسلم یونیورسٹی، علیگڑھ

۶۔ **ایم.آئی. بھارتی (۲۰۱۶): جامعہ ہمدرد کا مہا بھارت (انگریزی)۔ ایجوکیشن انڈیا' نئی دہلی.**

۷۔ **محمد اقبال** (۲۰۱۰): منصب شیخ الجامعہ، محترم مگر مطعون۔ ماہنامہ افکار ملی (نئی دہلی): دسمبر، ص ۳۵۔۴۰

۸۔ عابد رضا بیدار (۲۰۰۷): حیات عبدالعلیم کا ایک ورق، ذاکر صاحب کے مکاتیب کی روشنی میں۔ ماہنامہ ہماری زبان (جون۔۲۰۰۷، صفحات ۲۱۔۲۲) لکھنؤ

۹۔ عضدالدین خاں (۱۹۹۵): علیم صاحب (''علیم صاحب''، مرتّبہ محمد سالم قدوائی: ۲۰۴۔۲۰۶)، ادارہ علوم اسلامیہ۔ علیگڑھ مسلم یونیورسٹی، علیگڑھ

۱۰۔ افضال احمد صدیقی (۱۹۹۵): ڈاکٹر عبدالعلیم صاحب اور ان کی شخصیت (''علیم صاحب''، مرتّبہ محمد سالم قدوائی: ۲۱۵۔

۲۲۴)، ادارہ علوم اسلامیہ۔ علیگڑھ مسلم یونیورسٹی، علیگڑھ

۱۱۔ سید مرتضیٰ حسین بلگرامی (۱۹۹۵): روداد حیات (''علیم صاحب''، مرتّبہ محمد سالم قدوائی: ۵۲۔۶۴)، ادارہ علوم اسلامیہ۔ علیگڑھ مسلم یونیورسٹی، علیگڑھ

۱۲۔ احتشام احمد ندوی (۱۹۹۵): ڈاکٹر عبدالعلیم کی پروقار شخصیت (''علیم صاحب''، مرتّبہ محمد سالم قدوائی: ۱۶۹۔۱۷۷)، ادارہ علوم اسلامیہ۔ علیگڑھ مسلم یونیورسٹی، علیگڑھ

۱۳۔ رئیس فاطمہ (۱۹۹۵): پروفیسر عبدالعلیم، ایک عہد ساز شخصیت (''علیم صاحب''، مرتّبہ محمد سالم قدوائی: ۱۳۱۔۱۶۴)، ادارہ علوم اسلامیہ۔ علیگڑھ مسلم یونیورسٹی، علیگڑھ

۱۴۔ کبیر احمد جائسی (۱۹۹۵): عقیدۂ اعجاز قرآن کی تاریخ۔ ایک مطالعہ (''علیم صاحب''، مرتّبہ محمد سالم قدوائی: ۲۲۵۔۲۶۹)، ادارہ علوم اسلامیہ۔ علیگڑھ مسلم یونیورسٹی، علیگڑھ

۱۵۔ عبدالعلیم (۲۰۰۰): ''عقیدۂ اعجاز قرآن کی تاریخ'' چوتھا ایڈیشن، مکتبہ جامعہ، نئی دہلی/۱۲۲ ایس پی، سیکٹر۔ سی علی گنج لکھنؤ۔

☆☆☆

قاضی عبدالودود

ایک بھولے بسرے علیگ

قاضی صاحب علی گڑھ میں سید حسین بلگرامی صاحب نے فوج سے ریٹائر ہونے کے بعد ایک اسکول کیمبرج میں داخلے کے خواہشمند طلبہ کے لئے کھولا تھا، جگہ غالباً وہ تھی جسے سر سید ہاؤس کہا جاتا ہے، بلکہ وہ جہاں پر اب سر سید اکیڈمی ہے، قاضی صاحب کے زمانے مین انگلش ہاؤس کہلاتا تھا، وہاں جو طلبہ انگلستان میں داخلے کے لئے تیار کیے جاتے تھے، ان میں قاضی عبدالودود بھی تھے، جنھوں نے علی گڑھ کے بعد اعلیٰ تعلیم کیمبرج میں مکمل کی۔

اس بلگرامی اسکول میں داخلے سے قاضی صاحب علی گڑھ کالج کے باقاعدہ بورڈر تھے، اور میکڈانل ہاؤس میں رہتے تھے۔ یہ بھی بیان کرتے تھے کہ ان کے ایک ہاسٹل فیلو عبیدالرحمٰن خاں شروانی بھی تھے، جو بعد میں **خان بہادر** ہوئے۔ خان بہادر صاحب، صدر یار جنگ حبیب الرحمٰن خاں شروانی کے بیٹے تھے، اور ریاض الرحمٰن خاں شروانی کے باپ۔ آگے کا سلسلہ یہ ہے کہ ریاض صاحب کے صاحبزادے مدیح الرحمٰن خاں شروانی ہیں، جو باپ کے بڑے قدردان تھے اور ان کا رسالہ فکرِ نو جب تک نکلتا رہا اس کی اشاعت میں دامے درمے مدد کرتے رہے۔ انگریزی شعبہ میں استاد رہے، اور دس بارہ سال قبل اس وقت کے وائس چانسلر سے پالیسی معاملات میں اختلاف ہونے پر یونیورسٹی سے استعفیٰ دے دیا تھا۔

بات دور جا نکلی، ذکر قاضی صاحب یعنی قاضی عبدالودود کا تھا، تو میکڈانل ہاسٹل کی بات سناتے تھے کہ کسی لڑکے کا جھگڑا ہو گیا، جھگڑے نے طول پکڑا تو بورڈنگ ہاؤس کے سب لڑکے مچھردانیوں کے ڈنڈے لے کے رزم گاہ کی طرف دوڑ پڑے اور اور جھگڑا الوفرار ہو گئے۔ اس اسپرٹ کے لئے قاضی صاحب ''اسپرٹ دَی کور'' کے لفظ استعمال کرتے تھے اور کہتے تھے علی گڑھ میں یہ بات بہت بڑی تھی، کہ کہیں مصیبت آئے تو سب دوڑ پڑتے تھے۔

قاضی صاحب جس طرح کیمبرج سے اپنی وابستگی کا بڑی محبت سے کرتے تھے، علی گڑھ کو بھی اتنی ہی محبت سے یاد کرتے تھے، اور کبھی نہیں بھولے۔

☆☆☆

Aligarh Diaspora - 7

Launched to mark the Finalé (December 2021) of AMU Centenary Celebrations 2020-21

VICAR OF HYDERABAD

by **Muhammad Tariq Ghazi**

Director. Umam Studies House (USH) Toronto. Canada

Upon hearing the sad news about Vicar today I remembered many friends. Vicar. That is how he spelled his name, even though he was not a deputy bishop, nor associated in any way with Rome or the Vatican. He is a lucky Muslim Indian, passing away into the realm of eternal tranquility free of all worries that crores of Indians and billions of worlders are facing involuntarily.

Mir Ayoob Ali Khan has recorded details of the end of Syed Vicaruddin's journey. PRO of the Aligarh Muslim University has issued a brief obit on Vicar's demise, together with a condolence message from the Vice Chancellor. Vicar deserved condolence from his alma mater, even if briefly, denoting that he has not been ignored or forgotten by us. However, the present generation of Aligarians does not know much about Vicar or perhaps about AMU generations of the 1950s-1960s.

Let me start with my association with Vicar.

We were classmates in political science and batch-mates in the class of 1963. Long time ago! More about this group later. First, recollecting old memories about Vicar.

We met several time in post-Aligarh years. Once when I was visiting Hyderabad from Calcutta, he came to see me and took me to his home for dinner. We had a very long discussion about situations in India, Arabs and the world. Then he suggested to "merge" Rehnuma e Deccan and Asr e Jadid. I told him that Urdu newspapers were hanging by the horns of a dilemma. Before independence they used to be a mission; after independence, mission was no longer saleable and Urdu media could not become an industry since these newspapers were deprived of public and private ads. Another aspect, I told him, was that as owner of Rehnuma he was free to take decisions, but owner family of Asr e Jadid would not agree to the proposal. By name and character Rehnuma i Deccan was a regional newspaper even if it gave good coverage to international and Muslim world news, while Asr e Jadid appeared to be above regional outlook at least by name, but its local and regional news focused on West Bengal would not be of interest to Rehnuma readers. As Urdu newspapers had no share in the advert industry, they survive on small and local ads which had no market outside the given city.

Pensively, Vicar agreed but he wanted to make Muslim voice in Urdu heard in the country.

Once we met in Jeddah. He was on a Haj journey and came to see me in my office. There he informed me about founding of the Indo-Arab League. He remained a diehard supporter of Palestinian, while Arab regimes one after another ditched what was the only Arab cause in the world guaranteeing their political distinction.

Vicar was a sportsman first and foremost. Journalism was his family obligation. As owner-editor of historic Hyderabad daily Rehnuma e Deccan, he groomed some good journalists in Hyderabad like Hasan Farrukh marhoom and Fazil Husain Parvez. I think Ahsan Ali Mirza was also a member of the Rehnuma family. But he was much senior to Vicar.

In Aligarh Vicar played cricket and would spend evenings in the cricket ground behind the university masjid on Anupshahr Road. He was member of AMU cricket team under captaincy of (I think, M A – Muhammad Ali) Wadi in 1960, if I remember his name correctly. Next year Vicar was chosen AMU cricket captain. In that capacity he was allotted a full room in SSHall, where he was privileged to stay single in the backroom and using the coir-carpeted front room as his "Durbar Hall" – as both Diwan i Aam and Diwan i Khas. Memories as old as six decades are failing me. I think that room was in SSEast, VC office wing.

In those years SSHall-ers had the honor of having law Prof Dr Hafeez-ur-Rahman as provost, immediate successor to Al-Ghazali fame Prof Muhammad Umaruddin of philosophy.

Vicar would spend most of his time with varsity sportsmen of different playfields. However, sometime he would join us in the dusty Madras Café – or *Minim*, Aligarh *angutha* (people call it *thenga*) to Maxim – in the dirt depths (on two sides of paved road) at Shamshad Market over a cup of Green Label brew and a bite or two on a rhombus named barfi, as dry as brain of a scholar, and a similarly shaped but more pronounced elongate salted mayda-cuts-and-crumbs called namak-para.

Vicar was a Madras Café nationalist in his own way. Once over a cup of tea, he announced that Mukesh was a greater singer than Rafi – '47 in tinsel cry-more- than-hue. In his view, some songs were sung by Mukesh *because* Rafi was unable to sing them. But in the female singing hall he had no choice because Lata tyranny would not allow any female singer to survive in the woodywood except her sister Asha. So, nationalist choice was nonexistent in the argento harem. Incidentally, Vicar remained single all his life.

Our batch was known for sportsmen, some of them of world fame. Vicar, Basharat Husain, Ali Saeed, Inamur Rahman and Sultan of Bhopal – the last three playing hockey. Ali Saeed (Gold in 1968 Tokyo) and Inam (Bronze in 1972 Munich) both were Olympians. The two were among the best hockey players Aligarh and India had produced. All the five sports stars were in the batch which graduated in 1963.

Muhammad Tariq Ghazi

SS Hall. BA. 1963. An essayist, political and social analyst, veteran journalist of Urdu and English who worked with the Times of India and Saudi Gazette. He has authored and edited ten published books. And several unpublished works.

Whitby. Ont. Canada
Friday 10 December 2021

***